پروفیسر محمد شفیع اختر

ہمارا ثقافتی ورثہ

کسی قوم کی ذہنی، اخلاقی، فکری، ادبی، معاشی اور سیاسی سرگرمیوں کے اس منتج کو جو ایک مدتِ دراز کے تعامل سے پیدا ہوتا اور ایک واضح شکل اختیار کرتا ہے، اس قوم کی ثقافت کہا جاتا ہے۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ جس ثقافت کی عمر جتنی کم ہوگی اسی قدر وہ مبہم اور سطحی ہوگی اور اسی طرح وہ ثقافت بھی جو اپنی طبیعت و فطرت میں عالم گیر نہ ہو اور جس کے عناصر ترکیبی کا تعلق پوری نوعِ بشر سے نہ ہو وہ کسی عظمت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم پاکستانیوں نے اس پچیس سال میں کوئی نئی ثقافت تشکیل دی ہے۔ یا ہم کسی قدیم ثقافت کے وارث ہیں اور اس کی ترقی اور فروغ دینے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر ہم کسی قدیم ثقافت کے مالک ہیں تو پھر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس ثقافت کے خدوخال اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اس کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ کیا اس کی تعیین اور تشخص ممکن ہے اور کیا اس کا کوئی وسیع خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے؟ اس ضمن میں ہم کو ایک اور اہم مسئلہ کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور وہ یہ کہ کیا موئن جو دڑو، ہڑپا اور ٹیکسلا کی قدیم تہذیبیں ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں؟۔

اس امر پر تو تقریباً سارے پاکستانی متفق ہیں کہ ہم یقیناً ایک قدیم ثقافت کے وارث ہیں۔ لیکن یہاں شروع سے ایک مکتبِ خیال موجود ہے جو مذکورۂ بالا تہذیبوں کو پاکستان کا ثقافتی ورثہ سمجھتا ہے اور اس نظریہ کو عام کرنے کے لیے اسی طرح کوشاں ہے جس طرح ایران کے بعض لوگ عہدِ زرتشت و جمشید اور مصر کے بعض لوگ عہدِ فراعنہ کی تہذیبوں کو اپنا ثقافتی ورثہ سمجھتے ہیں

یہ لوگ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، موئن جو دڑو، ہڑپا، ٹیکسلا اور اسی طرح کے کچھ اور قدیم تہذیبی آثار ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ہم یقیناً ان کے مالک ہیں اور ہمیں اس بات

پر خوشی اور فخر بھی ہے کہ زمانۂ ماقبل تاریخ میں ایسی شاندار تہذیبیں اس خطۂ زمین میں ابھریں اور پروان چڑھیں، جس میں آج ہم بستے ہیں۔ لیکن تاریخی طور پر ان تہذیبوں سے ہمارا کبھی رابطہ نہیں رہا اور نہ ہی انھوں نے ادبی یا فکری یادگاریں چھوڑیں جن کے دھندلے سے نشانات بھی ہمارے موجودہ ثقافتی ورثہ میں تلاش کیے جا سکتے ہوں۔ یہ درست ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد اسی خطے میں آباد تھے اور ان کی ثقافت بلاشبہ ان کے اسلاف کے فکر و ادب سے متاثر بلکہ متشکل ہوئی ہوگی۔ لیکن اسلام کے آنے سے بہت پہلے وہ تہذیبیں اور ان کے نام و نشان تک مٹ چکے تھے اور اگر ہمارے اجداد میں غیر شعوری طور پر ان کے کچھ آثار موجود بھی تھے تو اسلام کی نہایت اعلیٰ اور طاقتور ثقافت ان پر اس طرح غالب آگئی کہ اب تلاش و تحقیق سے بھی ان کا پتہ نہیں چل سکتا اور عقلی یا تاریخی طور پر ہم ہرگز یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ ہم وادیٔ سندھ کی اس قدیم تہذیب کے باقیات صالحات ہیں۔

پاکستان کا ثقافتی ورثہ

حقیقت یہ ہے کہ ہم اس ثقافت کے وارث ہیں جو پہلے محمد بن قاسم اور عرب فاتحین کے ساتھ اور پھر ترکوں، افغانوں، مغلوں اور ایرانیوں کی قیادت میں یہاں آئی تھی۔ اس ثقافت نے یہاں بہت نشیب و فراز دیکھے، بہت کچھ اپنایا اور حاصل کیا اور بہت کچھ کھویا۔ اس کے باوجود اس کی اصلیت زائل نہیں ہوئی اور آج تک اس پر اسلام کی مہر ثبت ہے اور بقول قائداعظم:

دین و عقائد، تاریخ و تمدن، رسم و رواج، جذبات و احساسات، فکر و ادب۔ غرض کہ ہر زاویۂ نگاہ سے مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک علیحدہ قوم ہیں۔

قائداعظم نے ایک جملے میں ہمارے ثقافتی ورثہ کی بہترین تصویر کھینچی ہے اور ذیل میں اسی ثقافت کی روح کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

اسلامی عقائد اور شریعت کی حکمرانی

پاکستان اس آزاد اسلامی دنیا کے مشرقی سرے پر واقع ہے جس کے مغربی کنارے پر مراکش ہے اور مشرق بعید میں یہ سلسلہ انڈونیشیا تک پہنچتا ہے۔ اگرچہ اب ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت ہے۔ لیکن وہاں کے مسلمان بھی اپنی جداگانہ اسلامی ثقافت کے حامل ہیں۔ چنانچہ افریقہ اور ایشیا کے اس

طویل اور عریض خطے میں اسلامی ثقافت کی فرماں روائی ہے جو بنیادی طور پر ہر جگہ ایک ہے۔ اور اس کی وحدت کا ضامن اسلام کا عقیدہ اور اس کی شریعت ہے۔ اگرچہ اسلام پر پورا عمل کہیں نہیں ہے لیکن اس پر عمل کرنے کی آرزو ہر جگہ ہے۔ یہی تمام مسلم اقوام عالم کا نصب العین ہے اور کم از کم نجی اور شخصی زندگی میں دنیا کے تمام مسلمان ایک ہی شریعت کے پابند ہیں۔ جزوی اختلاف سے قطع نظر دینی رسوم کے طریقے ہر جگہ یکساں ہیں۔

اسلام کا اخلاقی نظام

کسی دین کا سب سے بڑا مظہر اس کا اخلاقی نظام ہوتا ہے۔ اسلام کی ایک سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہے۔ اس اعتبار سے بھی پوری اسلامی دنیا میں حق و باطل، جائز و ناجائز، حلال و حرام اور پسندیدہ و ناپسندیدہ کا ایک ہی معیار ہے

یہ صحیح ہے کہ ہر دور اور ہر ملک کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ان کی رعایت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں اتنی لچک ہے کہ ان تمام تقاضوں کو پورا کر سکے۔ پاکستان کی اکثر آبادی اس اخلاقی نظام کو اپنا ثقافتی ورثہ سمجھتی ہے اور اسی پر چلنا چاہتی ہے خواہ اس کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ آخر اسلامی نظام اخلاق ہے کیا۔ تو ہم عرض کریں گے کہ ہر مسلمان مجموعی طور پر اس سے واقف ہے۔ تاہم چونکہ بعض حضرات دانستہ طور پر اس سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے ہم اس نظام کی صرف وہ خصوصیات پیش کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں عملاً موجود ہیں اور جن کے بارے میں بہت کم لوگوں کو اختلاف ہے۔

سب سے بڑا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ جس بات کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اس کا ماننا ضروری ہے۔ اور جس چیز سے روکا ہے اس سے رکنا ضروری ہے۔ جس کو معروف کہا ہے وہ معروف ہے۔ جس کو منکر کہا ہے وہ منکر ہے۔ اور ہمارے نزدیک خیر و شر وہی ہے جس کو خدا اور اس کے رسول نے خیر و شر کہا ہے۔ اسلامی اخلاق کا آخری معیار خدا اور رسول کا حکم ہے۔ انسانی ضمیر کی آواز صحیح ہوتی ہے اور غلط بھی۔ کیونکہ وہ بسا اوقات دھوکا بھی دیتی ہے۔ اس لیے اُسے تائیدی حیثیت تو حاصل ہے مگر اسے آخری حکم نہیں بنایا جا سکتا۔

اسلامی اخلاق کا دوسرا بنیادی اصول خدا کے سامنے جواب دہی کا عقیدہ ہے۔ یعنی انسان کو اپنے تمام اعمال کے لیے ایک دن خدا کے آگے جواب دینا پڑے گا۔ اس لیے خیر و شر کے انتخاب میں اسے صرف حکومت اور معاشرے ہی سے نہیں ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بڑھ کر اس خدا سے ڈرنا چاہیے جو سب کچھ دیکھتا ہے اور سنتا اور جانتا ہے۔

اسلام نے یہودیت کی طرح انسانی اخلاق کی تفصیلی گرامر نہیں مرتب کی ہے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ اللہ کا رسول لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر:

ضمیر امتاں را می کند پاک

وہ انسانوں کے دلوں کو پاک کر کے ان کو خیر و صلاح سے بھر دیتا ہے اور ان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ دنیا میں جو بھی عمل کریں صحیح کریں۔ خیر و شر کی تمیز ہی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا۔ آج پوری انسانیت اس امر پر متفق ہے کہ دنیا میں عدل اور قانون کی فرماں روائی اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب لوگوں کے دل پاک ہوں۔ یعنی وہ خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی آواز سن کر حق کو حق کہیں اور باطل کو باطل۔ مگر ضمیر کی آواز اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب وہ پاک ہو۔ اجتماعی ذمہ داری کا احساس اسی پاک دلی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر آج ہمارے دل پاک ہوتے تو ہم پر صوبائی اور علاقائی عصبیت کا بھوت سوار نہ ہوتا۔ نہ بنگلہ دیش وجود میں آتا۔ نہ چار قومیتوں کے نعرے بلند ہوتے۔ نہ اہلِ دولت غریبوں کا استحصال کرتے۔ نہ غریب بیزار و بدگمان ہوتے اور نہ چند افراد مفادِ امت کو پس پشت ڈال کر اپنا اقتدار قائم کرنے کا خواب دیکھتے۔

اسلام کا مقصد ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانا ہے جو اجتماعی عدل پر مبنی ہو۔ جہاں لوگوں کو اپنے حقوق اور فرائض کا صحیح احساس ہو۔ اور یہ احساس جیسا کہ ہم نے عرض کیا صرف پاکِ ضمیر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے محض آخرت کا عقیدہ کافی نہیں، دنیا کا مادی ماحول بھی پاک ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ معاشرے کی صالح تنظیم کے لیے اسلام نے ایک اہم اخلاقی اصول یہ دیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اور بے باکانہ اختلاط نہ ہو۔ ورنہ فساد کا پیدا ہونا

ایک لازمی امر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں ملفوف ہو کر باہر نکلیں یا کھیتوں اور کارخانوں میں کام نہ کریں۔ یا ان پر کوئی خاص پابندی عائد کی جائے۔ بلکہ معاشرتی اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت تمام اخلاقی قیود اور حدود توڑ کر بے باکی اختیار نہ کریں۔ ورنہ اس سے وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو مغربی ممالک میں ہوا ہے۔ جہاں جنس ہر چیز پر غالب ہے اور جنسی جرائم اپنے انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں

اسی طرح حیاداری اسلامی اخلاق کا ایک بنیادی اصول ہے۔ جن قوموں نے بے حیائی خصوصاً جنسی بے حیائی اور عریانی اختیار کی وہ بہت جلد اپنے انجام کو پہنچیں۔ آج کل آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے نام سے بے حیائی پر عمل ہو رہا ہے اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

اسلام نے تمام منشیات کو حرام قرار دیا ہے۔ آج دنیا میں جرائم کے دو سب سے بڑے سرچشمے جنس اور منشیات ہیں اور یہ اسلام کا احسان ہے کہ اسلامی دنیا اپنی تمام پسماندگی کے باوجود ان جرائم سے نسبتاً بڑی حد تک پاک ہے۔

علم و ادب

مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک مغربی دنیا پر سیاسی، علمی اور تمدنی فرمانروائی کی۔ اس عرصہ میں تمام علوم و فنون کے وہی مالک تھے۔ انھوں نے علم کی نئی راہیں کھولیں، نئے تجربہ کیے۔ نئے علوم مدون کیے۔ ہزارہا کتابیں لکھیں اور دنیا کے علمی خزانے کو اپنے کارناموں سے معمور کر دیا۔ یہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ لیکن ہم فخریہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا یہ تمام کام ہمارا ثقافتی ورثہ ہے۔ اس عظیم کام میں جس طرح عرب، ایران، مصر، شمالی افریقہ ترکی، وسطی ایشیا اور انڈونیشیا کے مسلمان شریک ہیں، اسی طرح ہندوستان و پاکستان کے مسلمان بھی۔ اگر ان علوم اور کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ ان سب میں ایک ہی طرزِ فکر کارفرما ہے اور تقریباً ایک ہی تمدن کی عکاسی ہے۔ مثلاً کوئی کتاب الجزائر یا ترکی کے تمدنی حالات پر لکھی گئی ہو تو وہ آسانی سے پاکستان یا انڈونیشیا کے حالات پر منطبق ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مقامی اختلافات سے قطع نظر، بنیادی طور پر تمام مسلم ممالک ایک ہی ثقافتی ورثہ کے مالک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلامی دنیا کے تمام مشاہیر کو اپنا قومی ہیرو

سمجھتے ہیں۔ ان کی یادگاروں کو زندہ رکھتے ہیں۔ ان کے دن مناتے ہیں۔ ان کے نام سے اپنے ثقافتی اور قومی اداروں کو منسوب کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا کے باہر یہ بات کہیں نہیں ملے گی۔ مثلاً برطانیہ میں فرانس کے کسی جنرل، ادیب یا مفکر کی کوئی یادگار نہیں ملے گی اور نہ ہی کوئی انگریز اس پر فخر کرے گا۔ حالانکہ دونوں ملکوں کے باشندے عیسائی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا ثقافتی ورثہ مشترک نہیں ہے۔

افکار و نظریات

دین و شریعت، اخلاق و آداب، علوم و فنون، فلسفہ و حکمت اور سیاست و معیشت کے بارے میں پوری اسلامی دنیا میں ایک ہی جیسے افکار و نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس کا اہم سبب یہ ہے کہ اسلامی دنیا کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ اسی لیے مسلم علما و مفکرین کے خیالات و نظریات اور اندازِ فکر بھی ایک جیسے رہے ہیں۔ ہم اس طرزِ فکر کے وارث ہیں اور ان فکری کارناموں کے بھی جو اس فکر کا نتیجہ ہیں۔ یوں تو علم و فن اور افکار ساری دنیا کی میراث ہیں لیکن یہاں یہ بحث نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ اسلامی عقائد و اخلاق اور معاشرت و تمدن سے متاثر ہو کر جو افکار و نظریات ظاہر ہوتے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی میراث ہیں اور اس ملت میں ہم بھی شریک ہیں۔

سیاست و معیشت

اجتماعی زندگی کے دو بہت اہم شعبوں سیاست و معیشت میں بھی اسلامی دنیا میں اسلامی تمدن کی اعلیٰ روایات موجود ہیں جو ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ طرزِ حکومت تو ایک وقتی چیز ہے۔ حالات کے اعتبار سے وہ بدلتا رہتا ہے۔ دنیا میں عرصۂ دراز تک شخصی نظامِ حکومت رائج رہا۔ صرف پچھلے دو سو سال یا یوں کہیے کہ انقلابِ فرانس کے بعد سے جمہوریت کا دور دورہ ہوا ہے۔ بعض مفکروں کا خیال ہے کمیونسٹ ریاست کا قیام جمہوریت سے بھی آگے ایک قدم ہے۔ خصوصاً چین کا نظام جس پر آج تمام عالم رشک کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیاست میں اصل اعتبار قیامِ عدل کا ہے، نوعِ حکومت کا نہیں۔ اس لحاظ سے آج کل کی بہت سی جمہوریتیں قرونِ وسطیٰ کی شخصی حکومتوں سے یقیناً بدتر ہیں۔

لہٰذا جب ہم اسلامی دنیا کی گزشتہ سیاست کو سراہتے ہیں تو بنو امیہ، بنو عباس یا افغانوں مغلوں اور ترکوں کی شخصی حکومتوں کی تعریف کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے دور میں کہاں تک عدل قائم ہوا اور اس کا کیا معیار تھا۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً زمانۂ حال تک مسلم مملکتوں میں عدل کا معیار باقی دنیا کی نسبت زیادہ بلند رہا ہے اور اس معاملہ میں مذہب و نسل کا کبھی لحاظ نہیں کیا گیا اور امارت و غربت یا جاہ و منصب سے عموماً عدل متاثر نہیں ہوا۔ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ جو عادلانہ اور فیاضانہ سلوک رہا اس کی مثال آج بھی دنیا کی کوئی غیر مسلم مملکت پیش نہیں کر سکتی۔ شخصی اور ضمیر کی آزادی کے بھی مسلم مملکتوں نے ہمیشہ بہترین نمونے پیش کیے۔ البتہ جب یہ آزادی سیاست میں ملوث ہوئی تو سلب کر لی گئی۔

خلافتِ اسلامیہ کی روح اور نوعیت یقیناً جمہوری ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے کوئی ایک متعین دستور نہیں دیا ہے اور مسلمان ہر دور میں اسلام کے مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے حالات کے لحاظ سے ایک مناسب دستور بنا سکتے ہیں۔ اس لیے اس زمانہ میں اگر ہم جمہوری یا کوئی اور مناسب طرزِ حکومت اختیار کریں تو کر سکتے ہیں۔ مسلم بادشاہوں کا شخصی اور موروثی نظام ہمارا ثقافتی ورثہ نہیں۔ مگر ان کا عدل، ان کی فیاضی، ان کی رواداری، بندگانِ خدا کی خدمت اہلِ مذہب کے ساتھ منصفانہ سلوک، رعایا کی خوشحالی کا اعلیٰ اہتمام اور ظلم کا استیصال، یہ سب چیزیں ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں۔

معیشت کے باب میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مسلم مملکتوں میں عام طور پر اسلامی نظامِ قانون رائج رہا۔ اس لیے حرام اشیا کی تجارت اور کاروبار کے ناجائز طریقے ہمیشہ ممنوع رہے اور زرِ مبادلہ کمانے یا ٹیکس وصول کرنے کے لیے ناجائز اشیا کی تجارت کی کبھی اجازت نہیں ملی تھی۔ موجودہ مسلم حکومتوں کے لیے بھی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔

ثقافتی ادارے

دنیا میں وہی معاشرہ قائم اور زندہ رہتا ہے جو اپنی بقا اور ترقی کے لیے کچھ مستقل اور پائدار ادارے قائم کرتا ہے، حکومتیں اور سلطنتیں اٹھتی اور گرتی رہتی ہیں لیکن معاشرہ باقی رہتا ہے دنیا میں آج اسّی کروڑ مسلم آبادی ہے اور یہ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت کوئی اسلامی

ملک دنیا کی عظیم طاقتوں میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ کئی ایک کا وجود خطرے میں ہے، پھر بھی ملتِ اسلامیہ کی بقا کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس بقا کا راز کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا سبب وہ تین عظیم الشان ثقافتی ادارے ہیں جو دنیا کی کوئی اور قوم، کوئی تہذیب، کوئی ریاست اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا اور وہ یہ ہیں:

۱۔ اخوت ۲۔ مساوات اور، ۳۔ اسلام کی جمہوری روح

قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں کو جوڑ دیا اور نعمتوں سے نواز کر ان کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اور یہ کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، وحدتِ ملی کا ایک طاقتور اصول بن گیا۔ اس ملت کی برادری میں داخل ہونے کے لیے صرف اسلامی عقیدے کا قبول کرنا کافی ہے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ اخوت کا رشتہ تمام دوسرے رشتوں پر ہمیشہ غالب رہا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حبشی، رومی، ایرانی اور مختلف قوموں، نسلوں اور رنگوں کے لوگ موجود تھے اور حضورؐ کی نظر میں ان کا مرتبہ بڑے بڑے عرب صحابہ سے کم نہ تھا۔ آخر بارگاہِ نبوی میں حضرت بلالؓ سے بڑا مرتبہ کتنے لوگوں نے پایا؟ یہی کیفیت خلافتِ راشدہ میں تھی اور بعد کی تاریخ بھی ایسی ہی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے اور قرآن مجید عربی میں نازل ہوا، مگر اسلامی عقیدے اور شریعت کی تدوین و تشریح اور اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی آبیاری ان تمام قوموں نے مل کر کی جو اسلامی برادری میں داخل ہوئیں۔ اسلامی دنیا کی سیاسی وحدت ٹوٹ جانے کے بعد بھی اخوت کے اس شاندار اور طاقتور رشتہ نے ملتِ اسلامیہ کو متحد رکھا۔ بعد میں جب اسلامی دنیا بے شمار آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تو اس وقت بھی یہ اصول قائم رہا اور بڑی آسانی سے ایک ملک کا مسلمان دوسرے مسلم ملک میں جا کر حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم سب جانتے ہیں کہ ابنِ بطوطہ جو ایک مراکشی مسلمان تھا سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا اور پانچ برس تک دہلی میں قاضی کے عہدے پر مامور رہا۔ یہ اخوت، یہ رواداری، یہ فیاضی، یہ محبت آج بھی باقی ہے۔ مسلم عوام کے دل آج بھی اسی جذبہ سے سرشار ہیں۔ دنیا کے کسی خطے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت

آتی ہے تو باقی مسلم دنیا اس سے غم زدہ ہو جاتی اور اپنی حد تک اس کی مدد کرتی ہے۔ اس اخوت کا مظاہرہ شخصی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ آج ہمارے یہاں افریقہ، یورپ، امریکہ آسٹریلیا یا کسی دور دراز خطے کا مسلمان آجاتا ہے تو اس سے مل کر ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے اور ہم اس سے عزیزوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ یہ رشتہ اس قدر مستحکم ہے کہ اگر دو مسلم مملکتوں کے درمیان مخالفت ہو تب بھی ان کے باشندوں کے درمیان رشتۂ اخوت منقطع نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانانِ ثقافتی وحدت کی سب سے بڑی ضمانت رشتۂ اخوت ہے اور یہ ہمارا ایک نہایت قیمتی ثقافتی ورثہ ہے۔

اسلامی تمدن کی طاقت اور بقا کا دوسرا راز مساوات کا اصول ہے۔ جب خدا نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں کو یہ پیغام سنایا کہ اس کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے تو یہ انسانی تمدن میں ایک عظیم انقلاب کا اعلان تھا۔ اسی طرح جب حضورؐ نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر اور گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے، تو یہ اس خدائی پیغام کی عملی شرح تھی۔ اس اصول کا منطقی اور تاریخی نتیجہ یہ ہوا کہ دائرۂ اسلام کے اندر آنے والے نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے بلکہ انھوں نے معاشرہ میں مساوی درجہ بھی حاصل کر لیا۔ سب مسلمان انسان کی حیثیت سے برابر ہیں۔ اگر کسی کو فضیلت ہے تو صرف تقویٰ اور اخلاق عالیہ کی وجہ سے ہے۔ خاندانی، نسلی اور قبائلی اور قومی فضیلتوں کے دعوے کو اسلام نے یکسر ٹھکرا دیا۔ ذاتی فضیلت بھی صرف عزت و احترام کی حد تک ہے ورنہ حقوق کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں ہزاروں آدمی بالکل پردۂ گمنامی سے اُٹھے اور اجتماعی زندگی کے اونچے سے اونچے مناصب پر پہنچ گئے اور ان کی ابتدائی بے وقعتی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔ اگرچہ برعظیم پاک و ہند میں ہندوؤں کے ساتھ رہ کر ہم بھی عصبیتوں میں مبتلا ہو گئے اور بعض خاندان دینی یا دنیاوی برتری کے اجارہ دار ہو گئے۔ لیکن اسلامی معاشرہ میں ان لوگوں کے لیے گنجائش نہیں اور ان کی یہ خود ساختہ فضیلت محض فریب ہے۔

اخوت اور مساوات کے اصولوں نے نہ صرف اسلام کے باقی رکھنے میں مدد کی بلکہ اس کی اشاعت میں بھی یہ بہت زیادہ مددگار ثابت ہوئے۔ افریقہ میں عیسائیوں کے تبلیغی ادارے اربوں ڈالر سالانہ ضائع کرتے ہیں اور مشکل سے کچھ عیسائی ہوتے ہیں۔ لیکن ہر سال کافی تعداد میں وہاں کے لامذہب لوگ اسلام پر ایمان لاتے ہیں۔ حالانکہ کوئی منظم اسلامی تبلیغی ادارہ وہاں کام نہیں کر رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اخوت اور مساوات کی نعمت بلا امتیاز سب کو حاصل ہے تو اس کو بہت بڑی رحمت سمجھ کر اس میں فوراً داخل ہو جاتے ہیں۔

تیسرا اصول اسلام کی جمہوری روح ہے۔ عبادات، اسلامی قانون، رسوم و شعائر، مجالس و تقاریب، تعلیم و تدریس، غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جمہوریت کی روح کارفرما ہے۔ مثلاً عبادات سے کوئی بالغ مستثنیٰ نہیں۔ قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہے۔ حقوق کے معاملے میں کسی کو ترجیح نہیں۔ نماز کا امام ہر مسلمان ہو سکتا ہے۔ جماعت، جمعہ اور عیدین کی نمازوں کو اسلامی تمدن میں بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ حج میں مسلمانوں کا ایک سالانہ عالمی اجتماع ہوتا ہے۔ اس میں ہر مسلم شریک ہو سکتا ہے۔ زکوٰۃ کا ادارہ بنیادی طور پر ایک اجتماعی ادارہ ہے، جس کا مقصد طبقات کے درمیان مالی فاصلے کو کم اور ختم کرنا ہے۔

اخوت، مساوات اور اسلام کی جمہوری روح نے اپنے باہمی عمل سے اسلام کے عالمی سفر کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ یہ عمل اس کی بقا اور فروغ کا بھی ضامن ہے اور یہ تینوں ادارے ہمارا بہترین ثقافتی ورثہ ہیں۔

اسلام کا معاشی نظریہ : محمد مظہر الدین صدیقی

عہد جدید کے معاشی مسائل پر اسلام کے ان بنیادی اور دائمی اصولوں کا اطلاق جن پر عہد رسالت کے تفصیلی اور فروعی احکام مبنی تھے۔ صفحات : ۱۰۹ قیمت ۲ روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور